چورنامہ

ڈاکٹر اسد رضا
F-97 سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی۔110025، موبائل:9873687378

اگر چہ ہم نہ تو کام چور ہیں اور نہ ہی دل یا نظریں چرانے والے، لیکن نہ جانے کیوں آج ہمارا قلم چوروں کے بارے میں چوری چوری چپکے چپکے کچھ لکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس سے کہا کہ اس سے قبل کہ کوئی چور شور مچائے، اسے چوروں کی اقسام بیان کرنی چاہئیں۔ بقول قلم چور کئی طرح کے ہوتے ہیں، لیکن قلم نے خود کو شاہِ جہان سمجھتے ہوئے سب سے پہلے ادبی چوروں کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے مطابق ادبی چوروں کی کئی ذیلی قسمیں ہیں۔ مثلاً نثری چور اور نظمی چور، نثری چور بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں جو افسانوں، ناولوں، داستانوں، سوانحی خاکوں، سفرناموں، رپورتاژ وغیرہ کا سرقہ کرے اسے فکشن چور کہا جاتا ہے، لیکن جو چور کلاسیکی، ترقی پسندانہ، جدیدیاتی، تاثراتی یا مابعد جدیدیاتی تحقیق کی چوری کرتا ہے اسے ادبی زبان میں تحقیقی چور قرار دیا جاتا ہے۔ عموماً ایسے چور ایم فل یا پی ایچ ڈی کرنے یا کرانے والوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔ تحقیقی سرقہ کرنے والے چور اکثر ڈاکٹر بن کر زبان وادب اور استاد ادب بن کر اپنے شاگردوں کو لسانی طور پر بیمار ڈال دیتے ہیں اور اردو کی خدمت کے نام پر لاکھوں کماتے ہیں۔ ایسے چوروں میں تنقیدی چور بھی شامل ہیں۔ یوں بھی تنقید و تحقیق میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن ادبی چوروں میں وہ چور بھی شامل ہیں جو کسی بڑے اور سینئر افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار، ناول نویس یا ڈراما نگار کی کہانی، منظر نامے، مکالمے، پلاٹ اور کردار وغیرہ کو تھوڑی ہیرا پھیری اور تبدیلی کے بعد دن دہاڑے چرا لیتے ہیں، لیکن ایسے چوروں کو کبھی کبھی حقیقی فکشن نگار عدالت میں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ تاہم ایسے ادبی چور اسے سرقہ نہیں بلکہ توارد کہہ کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبی چوری کے الزام بڑے بڑے لوگوں پر لگ چکے ہیں۔ کچھ زیادہ عیار اور شاطر قسم کے ادبی چور جو انگریزی یا دیگر کوئی یوروپی زبان جانتے ہیں، وہ اردو میں غیر ملکی زبان کی کتاب کا آزاد ترجمہ کر کے اسے اپنی اوریجنل تخلیق قرار دیتے ہیں۔ یہ چور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور بڑے سلیقے سے بیرونی مصنّفین کی تخلیقات کا سرقہ کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں آسانی سے گرفت میں نہیں لیا جا سکتا۔

جہاں تک نظمی چوروں کا تعلق ہے تو ان میں فلمی شاعر، مشاعرہ باز اور مترنم شاعر و شاعرات سرفہرست ہیں جو مرحوم اور استاد شعرا کے کلام کو نہایت دیدہ دلیری سے اپنا قرار دیتے ہیں اور اسے اپنے فلمی نغمے یا مشاعرہ میں شان سے استعمال کر کے داد و تحسین اور روپے بٹورتے بلکہ لوٹتے ہیں اور بڑے غرور سے فرماتے ہیں ''ہمارا نغمہ تو سپر ہٹ ہو گیا یا میری غزل نے تو مشاعرہ لوٹ لیا'' حالانکہ لوٹا تو انہوں نے اس شاعر کے کلام کو ہے جس کے اشعار کی چوری کی تھی۔ ایسے شاعر کا حال تو کچھ اس شعر جیسا ہوتا ہے:

شاعر تو کہہ رہا تھا کہ یہ شعر ہے مرا
اور شعر کہہ رہا تھا چرائے ہوئے ہیں ہم

اس سلسلہ میں معروف شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا یہ پر لطف واقعہ ہم نے کسی سے سنا تھا کہ ایک نومشق شاعر نے دانستہ یا نادانستہ طور پر فراق صاحب کا خیال اور مصرعہ چرا لیا۔ فراق صاحب نے جب شاعر کی سرزنش کی تو شاعر نے یہ عذر پیش کیا کہ ''اتفاق سے میرا شعر آپ کے شعر سے ٹکرا گیا۔'' یہ سن کر فراق نے غصہ کے ساتھ فرمایا: ''برخوردار، رکشہ کسی کار سے تو ٹکرا سکتی ہے، لیکن ہوائی جہاز سے نہیں۔'' دراصل فراق نے شاعر کے شعر کو رکشہ اور اپنے شعر کو ہوائی جہاز سے تشبیہ دے کر نومشق شاعر کو اس کی اوقات بتا دی۔ اسی طرح کچھ اسکالر دوسروں کی تھیسس چرا کر خود ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ علمی چوروں میں کتب چور بھی شامل ہیں جو موقع ملتے ہی کتابیں لیٹر باکس یا دکان سے چرا لیتے ہیں، مگر اب کتب چور کم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ کتابیں پڑھنے کا شوق آج کل ٹی وی، فیس بک اور انٹرنیٹ نے کم کر دیا ہے۔ کسی بڑے عالم یا رہنما کی تقریر کے حصے چرانے والے تقریری چور بھی ہمارے معاشرے میں ملتے ہیں۔

ادبی اور علمی چوروں کے علاوہ کچھ چوروں کی دیگر اقسام بھی ہیں۔ مثال کے طور پر داڑھی میں تنکے کے حامل چور بھی ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک حکایت بچپن میں کہیں پڑھی یا بزرگوں سے سنی تھی جس کے مطابق ایک باریش چور نے پڑوسی کے گھر سے بھوسا چرایا، لیکن چوری کے دوران بھوسا کا ایک تنکا اس کی داڑھی میں لگا رہ گیا۔ پڑوسی کی شکایت پر قاضی نے چور کی تلاش کے لیے سب مشکوک و غیر مشکوک لوگوں کو اپنی عدالت میں طلب کیا اور کہا کہ

''چونکہ چوری بھوسے کی ہوئی ہے اس لیے چور کی داڑھی میں تنکا ضرور لگا رہ گیا ہوگا۔'' یہ سنتے ہی چور اپنی داڑھی پر چپکے سے ہاتھ پھیر کر تنکا تلاش کرنے لگا تو قاضی نے فوراً اسے اپنے پاس طلب کیا اور سب کو چور کی داڑھی میں پھنسا ہوا تنکا دکھلایا۔ تب سے یہ محاورہ مشہور ہو گیا۔

اکیسویں صدی میں الیکٹرانک چور بھی پیدا ہونے لگے ہیں جو نیٹ پر چیٹنگ یعنی گفتگو کر کے دل چرا لیتے یا لیتی ہیں اور پھر محبوب کے گھر سے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے زیور اور بڑی رقوم چرا کر نو دو گیارہ ہو جاتے یا عموماً ہو جاتی ہیں کیونکہ اکثر دل چرانے والی دوشیزائیں ہی ہوتی ہیں اور جن کا زیور اور رقم چرائی جاتی ہے وہ بزرگ عاشق مرد ہوتے ہیں۔ اسی زمرہ میں سائبر چور بھی آتے ہیں جو مختلف طریقوں سے ای میل ہیک کر کے یا آپ کا اکاؤنٹ اور پاس ورڈ وغیرہ تبدیل کر کے بڑی بڑی رقوم بلکہ کروڑوں کی چوری کرتے ہیں۔ بہرحال ای رومانس، ای بزنس، ای جرنلزم، ای کامرس، ای اسپر یچوال ازم، (روحانی چمتکار دکھانے والے باباؤں، فقیروں کی کرامات کے ذریعے) وغیرہ الیکٹرانک چوروں کی جیتی جاگتی بلکہ دوڑتی بھاگتی اور کودتی پھاندتی مثالیں ہیں، لیکن سائبر چور کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں بن سکتا۔ اس چور کے لیے انٹرنیٹ کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے بی سی اے، بی آئی ٹی، ایم آئی ٹی، ایم سی اے، ایم ایس سی (کمپیوٹر) وغیرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح گردہ چور کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ایم ایس ہو اور آپریشن کے دوران اس صفائی سے گردہ چرائے کہ مریض کو پتہ بھی نہ چلے کہ اس کا ایک گردہ سرجن چرا کر لے گیا ہے۔

کوتوال کو ڈانٹنے والے چور بھی ہوتے ہیں، لیکن یہ چور عموماً اثر ورسوخ یا شہ زور اور بڑے زردار ہوتے ہیں جو نہ صرف داروغہ کو ڈانٹتے ہیں بلکہ بے چارے کو پیٹ بھی دیتے ہیں یا پٹوا دیتے ہیں اور پولیس افسر کو معطل نہیں تو کم از کم اس کا تبادلہ تو ضرور کرا دیتے ہیں۔ ایسے ہی چوروں کے لیے یہ محاورے ہیں کہ ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' یا ''چوری اور سینہ زوری''۔ اس قسم کے چوروں کو اپنے علاوہ سب چور نظر آتے ہیں۔ اگر ایسا چور کبھی گرفت میں آ بھی جاتا ہے تو وہ عدالت کے سامنے گردن ہلا کر چوری کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ایسے ہی چور کے لئے اردو میں ایک محاورہ ہے۔ ''چور چراوے اور گردن ہلاوے'' لیکن ایسے چوروں سے چوری کی عادت آسانی سے نہیں جاتی اور اس وقت بھی نہیں جاتی جب 'چور کے گھر مور' کا محاورہ ان پر صادق آ جاتا ہے یعنی خود ان کے گھر بھی چوری ہو جاتی ہے گویا ٹھگ بھی ٹھگا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ محاورہ بھی رائج ہوا کہ ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے'' یا یہ کہ ''چوری کی علت کبھی نہ جائے اور سمدھن کا تکلا چھ چھ جائے۔'' تاہم یہ محاورے آج بھی صحیح ہیں۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے نصف آخر میں چوروں کی ایک اور قسم سامنے آئی ہے اور وہ ہے چوٹی چور۔ گزشتہ برس کیا ٹی وی اور کیا اخبارات سب پر چوٹی چور جنہیں چوٹی کٹر یا زلف کتر بھی کہا جاتا، چھائے ہوئے تھے۔ تب خواتین کو اپنے زیوروں سے زیادہ زلفوں کے تحفظ کی فکر ہونے لگی تھی، لیکن خدا خدا کر کے زلف چور اتنے کم ہو گئے کہ اب اخبارات میں ان کی بھولے سے بھی خبر نہیں آتی۔ جب بجلی نہیں تھی تو چاندنی رات میں چوریاں نہیں ہوا کرتی تھیں اور عموماً اندھیری راتوں میں ہی چور سرگرم عمل ہوتے تھے۔ اسی لیے ''چور کا شاہد چراغ'' تھا، لیکن اب چور کا شاہد بلب یا ٹیوب لائٹ ہے۔ پہلے چور سیدھے سادے بھی ہوتے تھے لہٰذا یہ کہا جاتا تھا کہ ''چور کا مال ہر کوئی کھائے، چور کی جان اکا رت جائے'' لیکن جدید چور چھرے، چاقو اور بلیڈ و طمنچے سے بھی آراستہ ہوتا ہے اور بوقت ضرورت جان لینے سے بھی نہیں چوکتا۔ اسی لیے پرانا محاورہ ''چور کے پیر کہاں'' یعنی جلد گھبرا جانے والا چور اکیسویں صدی میں نظر نہیں آتا البتہ یہ کہاوت آج بھی صحیح ہے کہ ''چوروں کو سارے نظر آتے ہیں چور۔'' لیکن کچھ محاورے اب بوسیدہ اور بے اثر ہو گئے۔ مثلاً یہ محاورہ تھا کہ ''چور کی ماں کوٹھی میں سر دے کر روتی ہے۔'' لیکن ماڈرن چور کی ماں تھانے میں جا کر پولیس والوں کو رُلا دیتی ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ چور کا بھائی گرہ کٹ، لیکن اب چوری اور جیب تراشی باہم مدغم ہو گئے ہیں۔ جیب کترے گھروں میں چوری کرتے ہیں تو عام چور کبھی کبھی جیب تراش بھی بن جاتے ہیں۔ اب چور چور موسیرے بھائی بھی نہیں رہے بلکہ عام انسانوں کی طرح ایک چور دوسرے چور کا گلا کاٹنے لگا ہے۔

چور کی ایک اہم قسم وہ ہے جو دل چراتا ہے اور پھر آنکھیں چرانے لگتا ہے۔ ماضی میں تو اردو شاعری میں دل، جگر، نین اور چین چرانے والے چوروں کا تذکرہ ہے لیکن دور حاضر کا شاعر کہتا ہے:

چار آنکھیں کیا ہوئیں اس سے اسدؔ
نیند وہ میری چرا کر لے گیا

لیکن ایک شاعر چوری کی شکایت اس طرح کرتا ہے:

چرا کے دل وہ چلے گئے ہیں
نگاہیں بے تاب ہیں ہماری

لیکن اس مضمون کو پڑھ کر شاید کچھ خواتین یہ اعتراض کریں کہ ہم نے دانستہ طور پر صنفِ نازک کو نظر انداز کیا اور صرف مرد چوروں کو سر پر بٹھایا ہے۔ اس لیے ہم چور کی تانیث یعنی چورنی کے ذکرِ خیر کے ساتھ اپنے خامہ کو روکتے ہیں:

مسکرا کر بزم میں اِک چورنی
دِل ہی کیا سب کچھ چرا کر لے گئی

○○